مغربی فنِ تعمیر پر اسلامی فنِ تعمیر کے اثرات

از
مارٹن ایس برگس
مترجمہ
جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت ایم۔ اے لکچرر (عثمانیہ کالج اورنگ آباد)

ابھی ایک نسل اور گذرے تب کہیں جاکر کچھ دنوں کے ساتھ اس بات کا اندازہ لگایا جاسکے گا کہ فنِ تعمیر پر اسلامی دنیا نے کیا کیا احسان کئے ہیں۔ ہمارے موجودہ علم کا جہاں تک تعلق ہے اسلامی فنِ تعمیر کے بہت سے اہم پہلوؤں کے بارے میں اتنے شبہات باقی ہیں کہ کسی جوشیلے طرفدار ہی کو اپنی رائے پر پورا پورا اعتماد ہوسکتا ہے۔ بدقسمتی سے حال کا بہت سا تحقیقاتی کام جسے غیر یقینی نقاط پر روشنی ڈالنا چاہئے تھا، ہمارے آگے نزاعی بحثوں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ بحثیں اسلامی فنِ تعمیر کی پختگی کے دوروں کی خصوصیت سے کم ہی متعلق ہیں اور ہماری مغربی دنیا کے فنِ تعمیر کے ارتقاء پر اس کے اثرات کا ذکر تو ان میں بہت ہی کم ہے۔ بلکہ یہ تحقیقاتی کام زیادہ تر اسلامی فنِ تعمیر کی اصل اور اس کی ابتدائی عمارتوں کے حال پر مشتمل ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ تحقیقاتی کام اس سوال سے راست تعلق رکھتا ہے کہ اسلامی فنِ تعمیر نے بنی نوع انسان کو ورثہ میں کیا دیا ہے کیونکہ ہم اسلام کی میراث کا اس وقت تک ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں کرسکتے جب تک خود اسلام کے پاس اپنی کسی حقیقی چیز کے ہونے کا کوئی ثبوت ہمیں نہ مل جائے۔ بہ الفاظ دیگر کہا جاتا ہے کہ اسلامی فنِ تعمیر میں اتنی بہت سی چیزیں غیر مسلم قوموں سے لی گئی ہیں کہ بعض عالموں نے واقعی یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مسلمانوں نے تعمیری شکلیں مستعار ہی لی ہیں اور ان کا اپنا کوئی فنِ تعمیر نہیں۔ اس بنیادی نقطۂ نظر کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اسلامی فنِ تعمیر کی ابتدا اور اس کی ماہیت کا ایک عام خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔

آدھی صدی کے اندر عرب، حجاز سے لے کر مغرب میں ہرکولس کے ستونوں (Pillars of Hercules) تک اور مشرق میں ہندوستان کی سرحدوں تک صحرائی بگولے کی سی تیزی سے پھیل گئے اور انھوں نے پہلے سے متمدن بہت سے ملکوں کو فتح کرلیا۔ ان کی سلطنت اتنے وسیع علاقے پر پھیل گئی تھی کہ اتنا وسیع علاقہ رومی سلطنت کو اپنے انتہائی پھیلاؤ کے زمانے میں بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ ان علاقوں میں ایسی بہت سی قومیں آباد تھیں جن کا فن تعمیر رومیوں کے فن تعمیر سے مختلف اور بعض صورتوں میں اس سے بھی کہیں زیادہ قدیم تھا۔

قرون وسطیٰ کے مغربی فن تعمیر کے بارے میں اختلاف خیال پایا جاتا ہے۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ یہ فن تعمیر بڑی حد تک رومی ہے۔ اور ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اس کی ہر چیز ایران یا آرمینیا سے لی گئی ہے۔ اب چاہے کوئی اس اختلاف خیال میں کسی گروہ کا ساتھ دے، پر اب یہ بات واضح ہوتی جارہی ہے کہ آخر الذکر مکتب خیال ہماری سنجیدہ توجہ کا طالب ہے۔ آرمینیا، عراق (مسوپٹیمیا) اور ترکستان میں جو غیر معمولی دریافتیں ہوئی ہیں اور جو اگرچہ ہمارے سامنے نزاعی صورت میں پیش کی گئی ہیں، ان دریافتوں نے ہر چیز کے رومی ہونے کے نقطۂ نظر پر ہمارے اعتماد کو متزلزل کر دیا ہے۔ کلیسا نے صدیوں تک یہ عقیدہ پھیلایا کہ ہماری رومانسیکو (Romanasque) اور گوتھک عمارتیں شہنشاہی روما کے کھنڈروں پر ہی مبنی ہیں یا پھر ہمارے اس فریب تخیل کے ذمہ دار نشاۃ ثانیہ کے برخود غلط انسانیت دوست، ٹھیرائے جا سکتے ہیں۔ چاہے وجہ کچھ بھی ہو، یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اب ہمیں مشرق کی طرف غیر جانبدارانہ نظر سے دیکھنا چاہیئے اور سب سے پہلے ہمیں 'مشرق' کو ایک واحد علاقہ سمجھنے کی عادت بھی ترک کر دینی چاہیئے۔ ہم پر روما کے جو احسان ہیں، ان میں شاید ہی کسی کو سنجیدگی سے کوئی شبہ ہو لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اس بات کا اندازہ جانیئے کہ ہم کس حد تک اس کے ممنون احسان ہیں۔

عرب فاتحوں نے جو علاقے فتح کئے تھے ان میں شام، آرمینیا کا ایک حصہ اور شمالی افریقہ کا آباد علاقہ جس میں مصر بھی شامل تھا یہ سب کے سب علاقے مشرقی رومی مملکت سے حاصل

کئے گئے تھے۔ اسپین وسغوطیوں سے چھینا گیا۔ لیکن اس سے پہلے یہ علاقہ رومی صوبہ تھا۔ عراق، (مسوپٹیمیا) سے لے کر ترکستان اور افغانستان تک کے ملک خسرو دوم کی پچھلی ساسانی مملکت میں شامل تھے۔ اس پورے وسیع وعریض علاقے میں آرمینیا اور شام کی مشرقی سرحد تک نصرانیت کے قدم آچکے تھے۔ اور یہیں (جنوبی عرب) کے علاقے سنا میں چھٹی صدی عیسوی کا ایک کلیسا تک پایا جاتا تھا[1]۔ اس طرح فاتحوں کو اپنے مفتوحہ علاقے کے ہر صوبے میں آسانی کے ساتھ ماہر تعمیر کار مل گئے اور انھیں اپنے پیش رو قبطیوں اور وسغوطی نصرانیوں کی طرح بہت سی عمارتیں بھی مل گئیں جن کو فاتحوں نے آزادی کے ساتھ پتھر کی کانوں کی طرح استعمال کیا۔ اس ناقابلِ تردید حقیقت کا بڑا چرچا ہوا ہے، لیکن ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئیے کہ عربوں کو اپنی مملکت کے مشرقی صوبوں میں ایسے مقامی صناع بھی ملے جو ایسی طرز میں عمارتیں بناتے تھے جو رومیوں کی طرز سے بالکل مختلف تھی اور اگر ہم بعض ماہروں کی بات مانیں تو ان ہی صناعوں نے بازنطینی تعمیر کاروں کو وہ تمام باتیں سکھائی ہیں جن کی وجہ سے بازنطینی کام رومی کام سے مختلف نظر آتا ہے۔

پہلے عرب فاتحوں میں تعمیری کام کی مہارت پائی جاتی تھی اور نہ وہ اس کا ذوق رکھتے تھے یہی نقطۂ نظر عام ہے اور درست بھی ہے۔ اس پر جھگڑنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس وقت کے حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ ان میں اسی بات کی توقع کرنی چاہیئے اس طرح کی فتح سپاہیوں کی ایسی نسل ہی کو نصیب ہو سکتی تھی جن کی ہمتوں کو دینی جوش نے بلند کر دیا تھا اور جن کے وقت کا بڑا حصہ لڑائیوں اور عبادتوں میں بٹا ہوا تھا اس کے سوا یہ لوگ شہروں میں رہنے والے لوگ نہ تھے بلکہ خانہ بدوش بدوی تھے اور جب انھیں میدانِ کارزار سے فرصت ملی اور انھوں نے حکومت کا کاروبار سنبھالا تب بھی تعمیری صنعتوں میں انھیں ناگزیر طور پر مقامی صناعوں ہی سے یا اور

[1] بی اینڈ ای، ایم وِش شا، عربک اسپین (لندن ۱۹۱۲ء) ص ۱۲۲

B + E. M. Whishaw, Arabic Spain

یہ اہم بات ہے) ایسے صناعوں سے جو ایک مفتوحہ ملک سے دوسرے مفتوحہ ملک میں درآ کئے گئے تھے، کام لینا پڑا۔ اس طرح یہ معلوم ہے کہ آرمینیا کے سنگ ساز نہ صرف مصر میں بلکہ اسپین میں بھی کام پر لگائے گئے تھے۔ یہی نہیں غالباً اسی ملک کے سنگ سازوں سے فرانس میں نویں صدی کے کلیسا جرمگنی دس پرس (Germigny-des-Pres) کی تعمیر میں کام لیا گیا تھا جس میں بہت سی اسلامی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

فتح کے ابتدائی سالوں میں تعمیرکاری سے عربوں کی ممکنہ ناواقفیت کے باوجود اسلامی فن تعمیر کے بارے میں یہ حقیقت بہت نمایاں اور ناقابل انکار دکھائی دیتی ہے کہ اس نے تمام ملکوں میں اور تمام صوبوں میں اپنی واضح انفرادیت کو برقرار رکھا اگرچہ اس کے ماخذ ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے اس میں کچھ ایسی بات پائی جاتی تھی جو صناعی کے مقامی مکاتیب کے کام سے جو فنی طور پر اس کو عالم وجود میں لانے کا باعث ہوتا تھا، اسے امتیاز بخشتی تھی۔

اپنی انفرادی خصوصیت رکھنے والی ایک دوسرے سے مختلف بے شمار طرزوں کی تعمیرکاریوں کو ایک دوسرے میں کھپانے اور انھیں گھلا ملا کر ایک طرز ایجاد کرنے والا عامل غالباً دین اسلام تھا کیونکہ عربوں نے اپنے ابتدائی دنوں میں جو عمارتیں بنائیں وہ بڑی حد تک مسجدیں اور محل تھے اور بعد کی صدیوں کا بہت سا اہم تعمیری کام مسجدوں اور دوسری مذہبی عمارتوں پر مشتمل رہا جیسے مدرسے اور خانقاہیں جن کے ساتھ مسجدیں بھی ہوتی تھیں عربوں کی مخصوص اور اہم ترین عمارت مسجد تھی۔ مختلف مقامات کے لحاظ سے اس کی شکل و صورت میں تھوڑا بہت اختلاف ضرور پایا جاتا تھا لیکن اس کی اہم خصوصیات ہمیشہ برقرار رہتی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ مکہ میں اسلامی دنیا کے تمام حصوں سے آنے والے حاجیوں کے اجتماع نے مسجد کی شکل کو معیاری بنانے میں بڑا حصہ لیا ہے کیونکہ اپنے سفر میں حاجی جن جن شہروں سے گذرتا وہاں کی مقامی مسجدوں میں نماز ضرور ادا کرتا، اور اگر تعمیرکار صناع یا معمار ہوتا تو ان کے نقشوں پر ضرور دھیان دیتا۔

ے جے اسٹرازی گوؤسکی، نصرانی کلیسا کے آرٹ کی ابتدا، (آکسفورڈ ۱۹۲۳ء) ص ۴۲

J. Strzygowski: Origin of christian church Art.

۶۲۲ء میں حضرت محمدؐ نے مدینہ میں جو اولین مسجد بنوائی وہی بعد کی تمام مسجدوں کے لئے نمونہ بنی۔ یہ عمارت ایک مربع احاطہ تھی اور اسے اینٹ اور پتھر کی دیواروں سے گھیرا گیا تھا۔ اس کا کچھ حصہ جو غالباً شمالی حصہ تھا، اور جہاں رسول اللہ نماز کی قیادت فرماتے تھے، مسقف تھا یہ چھت غالباً کھجور کی ٹہنیوں کے ہوتے تھے ان پر مٹی ڈالی جاتی تھی اور انھیں کھجور کے تنوں سے سہارا جاتا تھا نمازیوں کی جماعت شمال کی طرف منہ کر کے بیت المقدس کے متبرک شہر کی سمت میں سجدہ ریز ہوتی تھی اور اس قبلہ گاہ کی کسی نہ کسی طرح نشاندہی کی گئی تھی۔ ۶۲۴ء میں نماز کی سمت بیت المقدس کی جگہ مکہ کی طرف پھیر دی گئی یعنی یہ سمت (مدینہ کی صورت میں) شمال سے جنوب ہوگئی۔ ایسی ابتدائی عمارت کے لئے کہیں اور سے تعمیری خصوصیات کے مستعار لینے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس کے لئے کسی قسم کی تعمیری خصوصیات سرے سے درکار ہی نہ تھیں۔

اس کے بعد دوسری مسجد عراق (مسوپٹیمیا) کے علاقے میں بمقام کوفہ ۶۳۹ء کے لگ بھگ تعمیر ہوئی۔ اس کا چھت مرمر کے ستونوں پر اٹھایا گیا تھا۔ یہ ستون حیرہ میں ایرانی بادشاہوں کے ایک پچھلے محل سے لائے گئے تھے۔ یہ مسجد بھی مربع تھی۔ لیکن اسے دیوار کی جگہ ایک خندق سے گھیرا گیا تھا۔ ایک چھوٹی سی مسجد عمرابن عاص نے فسطاط (قاہرہ) میں ۶۴۲ء کے لگ بھگ تعمیر کرائی تھی۔ اس کا نقشہ بھی مربع تھا اور کہتے ہیں کہ اس میں صحن نہ تھا۔ اس میں ایک نیا عنصر بھی داخل کیا گیا تھا۔ یہ ایک اونچا سا منبر تھا۔ پھر چند سالوں کے بعد امام کو مجمع سے محفوظ رکھنے کے لئے مقصورہ بنایا گیا۔ کہتے ہیں مینار اسی صدی کے ختم پر نمودار ہوتے۔ اور قبلہ نما محراب اس کے کچھ دنوں بعد نمودار ہوئے اس طرح اسی نو دسالوں کے اندر اندر مدینہ کی پہلی مسجد کی عمارت سے جامع مسجد کی تمام لازمی خصوصیات نے ارتقا پایا۔ جزئی اضافے ایوانات (واحد ایوان) تھے۔ یہ ایوانات سایہ دار دالان اور چھتے تھے جو صحن کو گھیرے ہوئے تھے اور لوگوں کو دھوپ سے بچاتے اور وضو کے لئے سہولت بخشتے تھے۔ اس مختصر سی فہرست میں تمام عہدوں کی مسجد کے دینی فرائض کے لوازم آگئے ہیں۔

جن عمارتوں کا اوپر ذکر ہوا ان میں سے اب ایک بھی اپنی اصلی شکل و صورت پر قائم نہیں۔ اب تو مسلسل تبدیلیوں کی وجہ سے ان کے نقشے تک بدل گئے ہیں لیکن نقشہ ہی اصل چیز ہے کیونکہ ابتدائی مسجد مشکل سے عمارت کہلا سکتی تھی اور جن معنی میں ہم تعمیری کام بولتے ہیں اس کا اطلاق تو کسی طرح بھی اس پر نہ ہوتا تھا تاہم ایم۔ غان برچم کا خیال ہے کہ اس ابتدائی مسجد کے نقشے کی اصل بھی ابتدائی نصرانی کلیسا ہی نے سجھائی تھی اس کا صحن رومی عمارتوں کے وسطی بے چھت صحن سے لیا گیا مرکزی ایوان کلیسا کی اصل عمارت سے لیا گیا، مقصورہ کلیسا کے مشرقی حصے سے لیا گیا، جہاں پادری کھڑا ہوتا ہے اور جس کے گرد کٹھرا بھی ہوتا ہے اور محراب گرجا کی نیم قوسی طاق سے لی گئی ہے اور مینار کلیسا کے مینار سے لیا گیا ہے لیکن مشکل ہی سے یہ خیال ضروری یا درست معلوم ہوتا ہے جب تک عربوں نے اس مذہبی احاطے یا پناہ گاہ کو فن تعمیر کا نمونہ نہیں بنایا اس وقت تک اس کے ماخذوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سادی سیدھی احتیاج سے لے کر شان و شکوہ کے حصول تک کا عبوری دور بہت گریز پا رہا۔ دین اسلام کی سخت گیری اور اس کے بہت سے پیروؤں کی سخت کوش مجاہدانہ زندگی کو پیش نظر رکھئے تو یہ سرعت حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔ حضرت محمدؐ کی وفات کے بیس سال کے اندر ہی مدینہ میں خود آپ کی مسجد دیواروں اور گھڑے ہوئے پتھروں کے پایوں کے ساتھ نئے سرے سے تعمیر کی گئی اور ساتویں صدی کے آخری سالوں میں بیت المقدس میں حضرت عمرؓ کے ۶۳۷ء میں شہر کی فتح کے بعد کی بنوائی ہوئی معمولی سی مسجد کے قریب (قبۃ الصخراء) کی شاندار عمارت تعمیر کی گئی۔ اس عمارت کا حجم اثر آفریں تھا۔ یہ یادگاری قسم کی عمارت تھی اور اسے خوب ہی سجایا گیا تھا لیکن یہیں سے ہم اس شدید اختلاف خیال کے چکر میں پڑ جاتے ہیں جو اسلامی فن تعمیر کے ماخذ کے بارے میں اب تک چلا آرہا ہے۔ قبۃ الصخراء پتھر کی ایک وسیع عمارت تھی در حقیقت یہ ایک مشہد (جائے شہادت) زائرین اس چٹان کا طواف کرتے تھے جس کے بارے میں یہ عقیدہ ہے کہ حضرت محمدؐ اسی کے اوپر سے اپنے معراج کے لئے روانہ ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں یہ عمارت بالکل منفرد ہی اور کم سے کم چار صدیوں تک صحن کے ساتھ جامع مسجد کے عام مربع نقشے میں کسی طرح کی کوئی اہم تبدیلی

لہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، مقالہ فن تعمیر

کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس لئے یہ فرض کر لیا گیا اور بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ فرض کر لیا گیا کہ قبۃ الصخرۃ محض رومی یا بازنطینی قسم کی عمارت ہے، بت پرستوں یا نصرانیوں کی بنائی ہوئی اس سے پہلے کی عمارتوں کی نقل ہے، اسے شروع سے آخر تک نصرانی معماروں نے بنایا ہے، اس لئے یہ ایک دوسرے فن تعمیر کا کارنامہ ہے اور عرب آرٹ کے اصل دھارے سے بالکل الگ کھڑا ہے۔ اس نقطۂ نظر میں ایک حد تک صداقت ضرور پائی جاتی ہے اور بظاہر اس میں کچھ معقولیت بھی نظر آتی ہے، لیکن اسے اپنی حد سے آگے نہیں بڑھانا چاہیئے۔

بغلی دالانوں والی اس قسم کی مدوّر عمارت کے بنانے میں عربوں کے سامنے ایک قطعی مقصد موجود تھا۔ وہ بیت المقدس کی 'مقدس چٹان' (صخرہ) پر جو یہودیوں اور مسلمانوں دونوں کے نزدیک ایک مقدس چیز تھی، ایک پرشکوہ عمارت بنانا چاہتے تھے اور وہ ایک ایسی عمارت تعمیر کرنا چاہتے تھے جو اس سے قریب ہی بنے ہوئے ضریح مسیح کے مشہور کلیسا کی حریف ہو اور شان و شکوہ میں اس پر سبقت لے جائے۔ یہ بنا مشہد، اس وسیع چٹانی سطح مرتفع کے وسطی حصے میں جو 'حرم شریف' کہلاتا تھا، ایک بڑا سا چبوترہ یا کرسی دے کر بنایا گیا۔ (اس کی سیدھ میں نقشہ کے مرکزی محور پر اس سے پہلے سے ایک مسجد بنی ہوئی تھی جو مسجد اقصیٰ کہلاتی تھی یہ ایک قدیم عمارت تھی۔ اس کی تاریخ اتنی مبہم اور پیچیدہ ہے کہ اس کا یہاں بیان کرنا لاحاصل ہے) اپنی عبادت گاہ کی نمایاں خصوصیت کے طور پر گنبد یا زیادہ صحیح معنوں میں، حلقہ نما مدور ہال کا انتخاب کر کے عربوں نے بڑی دانائی کا ثبوت دیا۔ یہ صحیح ہے کہ اسی طرح گنبد کو کسی مقبرے یا کسی مقدس مقام کی چھت کے طور پر اس کے سب سے اونچے اور پوری عمارت کو قابو میں رکھنے والے عنصر کی حیثیت سے عربوں سے پہلے رومی اور بازنطینی دونوں استعمال کر چکے تھے لیکن یہی قومیں کرۂ ارض پر گنبد بنانے والی اکیلی قومیں نہ تھیں۔ اسٹرازگووسکی، جو ایرانی تصورات کے بڑے مداح ہیں، کہتے ہیں کہ گنبد کی مشرقی طرز کی ابتداء ایشیائے کوچک یا مشرق بعید میں ہوئی، یہی طرز آرمینیا کے ذریعہ بازنطینیوں کے ہاتھ آئی، اور پھر ان سے بلقان کے علاقوں اور یونانی کلیسا کی سرپرستی میں روس

میں کھپی۔ اس طرح اگرچہ عربوں نے یہاں پہلی بار گنبد استعمال کیا لیکن وہ ایک ایسی چیز اختیار کر رہے تھے جو نہ تو بالکلیہ نصرانیوں کی تھی اور نہ ہی بالکلیہ رومیوں کی تھی۔ غالباً انھوں نے مشہور کنیسۃ القیامۃ (Anastasis) کے گنبد کی نقل کی تھی جو اس سے قریب ہی تھا، اور ٹھیک ٹھیک اسی کے حجم کا تھا۔ یقیناً شام اور آرمینیا میں گنبد والے کلیسا ساتویں صدی سے بہت پہلے سے موجود تھے اور قبۃ الصخرا اسی قسم کے کلیسا (یعنی ایک مثمن کے اندر مدور ہالی والے کلیسا) فلسطین میں پہلے سے موجود تھے۔ باقی چیزوں میں دیواریں ٹھوس پتھر کی ہیں اندرونی چھتوں اور دریچوں کے موکھوں کی کمانیں نیم قوسی ہیں اور دونوں چھتوں میں جتنے ستون استعمال ہوئے ہیں ان میں سے صرف دو قدیم زمانے کے ہیں اور بیت پرستوں یا نصرانیوں کی پچھلی عمارتوں سے لئے گئے ہیں۔ اس طرح ان ستونوں کے دھڑے اور نہ ہی ان کے سرستون طرز میں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں کمانوں کی حسبت کے اطراف زبردست چوبی شہتیروں کے جوڑ دئے گئے ہیں۔ یہ جوڑ غالباً زلزلوں کے جھٹکوں کا مقابلہ کرنے کے لئے دئے گئے ہیں جو اس علاقے میں عام ہیں یا پھر اس لئے دئے گئے ہیں کہ معماروں کو محض کمانوں پر بھروسہ نہ تھا۔ ایسی ہی حفاظتی تدبیریں بازنطینی عمارتوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ خود گنبد دہرا ہے اور پورے کا پورا لکڑی سے بنایا گیا ہے باہر کی طرف اس پر سیسہ اور اندر کی طرف منقوش اور رنگین پلاستر چڑھایا گیا ہے۔ لیکن یہ قدیم اصلی حصہ نہیں ہے۔ پچی کاری کا بیشتر کام اصلی ہے۔ لیکن باقی تزئینی کام کا بیشتر حصہ بعد کے زمانے کا ہے۔ اس طرح ہم قبۃ الصخرا میں یہ دیکھتے ہیں کہ گنبدی نقشہ، نیم قوسی کمانوں کا استعمال، چوبی جوڑ، اور غالباً پچی کاری نئی جدتیں ہیں۔ نیم قوسی کمان قطعی طور پر عربوں کی ایجاد نہ تھی، چوبی جوڑوں کی اصل مشتبہ ہے، اور پچی کاری کا قدیم ترین استعمال اسلام سے پہلے کی چیز ہے۔

قبۃ الصخرا کے بعد ترتیب زمانی کے لحاظ سے دوسری اہم اسلامی عمارت دمشق کی جامع ہے جو آٹھویں صدی کے ابتدائی سالوں میں تعمیر ہوئی ہے۔ اس کا صدر ایوان یا حرم ایک شاندار کمرہ سا ہے۔ جس میں اسے صحن سے الگ کرنے والی کمانوں کے اندر دروازے یا جالیاں بنی ہوئی

ہیں۔ صحن کی باقی تین سمتوں کو بھی چھتے دار برآمدے گھیرے ہوئے ہیں۔ صدر دالان کے ساتھ تین بغلی دالان ہیں، عرضی حصے کے ختم پر یعنی صدر دالان کی شمالی دیوار کے وسط میں محراب ہے جو قبلہ یا سمت کعبہ کی نشاندہی کر رہی ہے۔ مرکزی صحن کو گھیری ہوئی کچھ کمانیں پایوں پر اور کچھ کمانیں ستونوں پر اٹھائی گئی ہیں۔ یہ کمانیں گھوڑ نعلی، شکل کی ہیں۔ کمانوں کی یہی گھوڑ نعلی شکل آگے چل کر مغربی اسلامی فن تعمیر کی خصوصیت بننے والی تھی جس کے اسباب کچھ زیادہ واضح نہیں ہیں۔ گھوڑ نعلی کمان متعدد یا سرے پر نوکدار ہوتی ہے لیکن بہر صورت اس کا خماؤ جست کے خطاط کے نیچے ہی ہوتا ہے۔ دمشق میں مدوّر گھوڑ نعلی کمان استعمال کی گئی ہے، صدر چھتے کے اوپر اوپر سے صحن کے اطراف نیم قوسی سروں والے دریچے ہر کمان پر دو دو کے حساب سے بنائے ہیں جس رومی معبد کے احاطے (Temenos) کے چاروں گوشوں کے اندر یہ مسجد بنائی گئی ہے اس کے ہر گوشے پر ایک برج بنا ہوا تھا۔ انہی برجوں کو عربوں نے میناروں کی طرح استعمال کیا۔ اب ان چار برجوں میں سے صرف ایک برج (شمال مغربی گوشے پر) باقی رہ گیا ہے دوسرے مینار بعد کے زمانے کے ہیں۔ عمارت کا اندرونی حصہ مرمر پچی کاری اور رنگین شیشوں کے بڑے بڑے دریچوں سے سجایا گیا تھا۔ مسجد کے عام نقشوں سے اس مسجد کا نقشہ غالباً اس لئے الگ ہے کہ یہ مسجد میں تبدیل کئے ہوئے شامی کلیساؤں سے متاثر ہے۔ کلیسا کی طرح اس میں عرضی حصے کا داخلہ اور حرم کے وسط میں گنبد کا بنانا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس سے مقصود قبلہ کی اہمیت کو واضح کرنا تھا، اور یہ قبلہ نما تیسری بار ایک محراب کی صورت میں بنایا گیا ہے[1] محراب ممکن ہے خود عربوں کی اپنی ایجاد ہے دنیا کے ایک ایسے حصے میں جہاں آنکھوں کی بیماریاں بہت عام ہیں، جیسا کہ ایک بوڑھے شیخ نے مجھ سے ایک بار کہا تھا، محراب کو مجوف صورت میں اس لئے بنایا گیا کہ دیواروں کو چھو چھو کر اپنا راستہ طے کرنے والا اندھا آدمی فوراً اسے پہچان لے۔ یا ممکن ہے محراب نصرانی نیم قوسی طاق (Concha) سے لی گئی ہو۔ گھوڑ نعلی کمان قبل اسلام عمارتوں میں پائی گئی ہے جو پتھر میں تراشی گئی ہے لیکن دمشق میں اس کا ظہور ان اولین مثالوں میں سے ایک ہے جہاں یہ حقیقی تعمیری مقصد کے ساتھ استعمال ہوئی ہے مینار کا مقصد بالکل واضح ہے۔ اس سے موذن کے لئے ایک ایسی اونچی

---

[1] پہلی جوف محراب مدینہ میں بنی اور دوسری فسطاط (قاہرہ) میں۔

جگہ مہیا کرنا تھا جہاں سے وہ مومنوں کو نماز کے لئے بلا سکے[1]۔ یہ صدا عبادت گذاروں کو بلانے کے لوہے کا ٹکڑا پیٹ کر آواز کرنے (گھنٹے بجانے کی رسم شروع ہونے سے پہلے) کی نصرانی رسم اور یہودیوں کے بوق بجانے کے رواج کے مقابل ارادتاً ایجاد کی گئی ہے۔ اس مقصد کے لئے مینارہ استعمال کی پہلی مثال دمشق میں نظر آتی ہے۔

قدیم ترین باقی ماندہ مینار تونس سے قریب قیروان کی جامع کبیر کا مینار ہے اور تاریخوں میں لکھا ہے کہ یہ مینار خلیفہ ہشام (۷۲۴ء — ۷۴۳ء) کے عہد میں بنا ہے۔ یہ ایک زبردست اور بھاری بھرکم عمارت ہے اور اوپر کی طرف قدرے گاؤدم ہوتی گئی ہے۔ سب سے اوپر گھڑ نگج یا برجیاں بنائی گئی ہیں اس پر دو منزلیں ہیں، جن میں سے ایک بعد کے عہد کی ہے اگر یہ بھی درست ہو کہ دمشق کے چاروں مربع مینار پہلے مینار تھے جو اس مقصد کے لئے استعمال ہوئے تب بھی قیروان کے مینار کی بالکل سیدھی سادی سی عمارت کی اصل کو شام یا کسی اور خاص مقام سے منسوب کرنے کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی یہ ایک مذہبی ضرورت کی ایک مثال ہے جو کسی بناؤ کے بغیر نہایت سیدھے سادے انداز میں پوری کی گئی ہے اس کے سوا قیروان کی مسجد جامع مسجد طرز کی ہے۔ اس میں اکثر ردوبدل ہوئے ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے اس کی وہی صورت برقرار رکھی گئی جیسی کہ وہ نویں صدی کے آخر میں بنائی گئی تھی تونس کی جامع الزیتونیہ جو ۷۳۲ء میں بنی ہے جامع مسجد طرز کی ایک اور ابتدائی اور دلچسپ مثال ہے۔ یہ مسجد ایسے چھتوں سے بنائی گئی ہے جس کی کمانیں ناخوش گوار قسم کی ہیں اور ان کمانوں کو عہد قدیم کے ستون اٹھائے ہوئے ہیں کمانوں کے سرڈوں کے اوپر چوبی کھڈے یا پڑلے ہیں جو جوڑ دینے والی چوبی شہتیروں سے مربوط ہیں۔ اس تدبیر نے بہت سی ابتدائی اسلامی عمارتوں کے حسن وخوبی کو متاثر کر دیا ہے۔ اسپین میں قرطبہ کی جامع مسجد ۷۸۶ء میں بنی شروع ہوئی وہ اسی سلسلے کی ت ہے۔ اس کا رقبہ دسویں صدی میں پہلے رقبہ سے دگنے سے بھی زیادہ کر دیا گیا لیکن اس

---

[1] عربی لفظ "ماذنہ" اس مقام کو ظاہر کر رہا ہے جہاں سے اذان دی جاتی ہے اور موذن وہ ہے
جو اذان دیتا ہے۔

کی اصلی شکل اب بھی اس کی موجودہ عمارت کے بغور مطالعہ سے پہچانی جا سکتی ہے یہ ایک جامع مسجد تھی اس کا حرم بہت گہرا بنایا گیا تھا۔ حرم میں گیارہ بغلی دالان تھے جنہیں چھتے دے کر ایک دوسرے سے الگ کیا گیا تھا اور ہر چھتے میں بیس ستون تھے۔ یہ ستون، مذکورۂ بالا صورتوں کی طرح قدیم رومی عمارتوں سے حاصل کیے گئے تھے۔ حرم کے زبردست حجم کی وجہ سے اس کے لئے متوازن بلندی کی چھت بنانا ضروری ہو گیا تھا۔ حقیقت میں اس کے لئے اس سے بھی اونچی چھت بنانا ضروری ہو گیا تھا جتنی کہ قابل حصول معمولی ستونوں پر بنی ہوئی گھوڑ نعلی کمانیں اٹھا سکتی تھیں۔ اس لئے کمانوں کا ایک اور سلسلہ اور بلند تر سطح پر بنایا گیا۔ اس کی وجہ سے ایک گنجلک اور مضطرب سا اثر پیدا ہو گیا۔ جو کچھ خوش گوار نہیں۔ اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پہلے سے بنے ہوئے قدیم ستونوں کے استعمال نے قیروان اور قرطبہ دونوں جگہ چھتے کی صورت گری کو متعین کر دیا۔ اس کے برخلاف اگر یہاں اینٹ یا پتھر کے پائے استعمال کئے جاتے یا عمارت کے لئے خاص طور پر بنائے ہوئے بلند تر ستونوں سے کام لیا جاتا تو تعمیر کار کے لئے اس ناخوش گوار صورت سے اپنا دامن بچا لینا ممکن ہوتا۔ قرطبہ کی پوری مسجد کو ایک اونچی پشتہ دار دیوار سے گھیرا گیا تھا اور پورے صحن کے اطراف چھتے تھے۔

اب ہمیں عراق (مسوپٹیمیا) کی طرف لوٹ چلنا چاہئے جہاں اینٹ چونے میں کئی مسجدیں بنائی گئی ہیں۔ مسجدوں کا یہ سلسلہ اس ملک کی روایتی طرز میں بنا ہے۔ اسی سلسلہ کے ایک سرے پر مدینہ کی اولین مسجد ہے اور آخر میں قاہرہ کی مشہور جامع ابن طولون ان درمیانی مسجدوں کی مثالوں میں قابل لحاظ اخیضر، رقہ، ابودلف اور سامرہ کی مسجدیں ہیں۔ ان میں سے پہلی دو مسجدوں کے بارے میں اب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ آٹھویں صدی کے آخر کی ہیں اور آخر الذکر مسجدیں نویں صدی کے وسط کی ہیں۔ ان تمام مسجدوں میں ساسانی تعمیر کاری کی روایتیں پائی جاتی ہیں اور ان سب کو جامع مسجد کے نقشہ پر بنایا گیا ہے۔ اخیضر کی مسجد جس کا حال بڑے دلکش انداز میں آں جہانی گرٹروڈ بل نے اپنی عالمانہ کتاب میں بیان کیا ہے[1] ہمارے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہیں نکیلی کمان اپنی اولین صورت

---

[1] جی، ایل، بل، "اخیضر کا قصر اور مسجد" (آکسفورڈ ۱۹۱۴ء)

G. L. Bell, Palace + Mosque at Ukhaidir.

میں ملتی ہے۔ یہی نکیلی کمان آگے چل کر مغربی گوتھک فن تعمیر کی نمایاں ترین خصوصیت بننے والی تھی۔ سامرہ کی مخصوص کمان نیم قوسی کمان ہے۔ لیکن کبھی کبھار نکیلی کمانوں کے ابتدائی نمونے بھی نظر آجاتے ہیں۔ گھڑ نعلی کمانیں غالباً اس سے پہلے عراق (مسوپٹیمیا) میں استعمال ہوئی ہیں۔ ایسی بہت سی کمانیں شاہی کلیساؤں میں (مثلاً قصر ابن وردان کے کلیسا میں) موجود ہیں اور اطالیہ کے شہر چیوزی Chiusi میں تو واقعتاً یونانی کمانوں کی ایک مثال دکھائی دیتی ہے۔ اخیضر کی کمانیں بیضوی نکیلی اور قدرے اونچے ستون دے کر بنائی گئی ہیں۔ سامرہ کے قریب ابو دلف میں وہ خم واضح اختیار کر لیا ہے جو بعد کے اسلامی فن تعمیر کی خصوصیت بن گئی اور یہی شکل آٹھویں صدی کے آخر تک عراق (مسوپٹیمیا) میں کمانوں کی تمام شکلوں کی جگہ لینے لگی اس سے بہت پہلے کی نکیلی کمانیں کہیں کہیں ہندوستان میں ٹھوس پتھر میں کٹی ہوئی ملتی ہیں لیکن یہ پتھر میں کٹی ہوئی ہیں اس لئے حقیقت میں وہ کمانیں بالکل نہیں ہیں۔

سامرہ کی جامع کبیر بہت وسیع و عریض عمارت ہے اور کافی تاریخی اہمیت کی حامل ہے اس میں ایک صحن ہے مکہ کی سمت میں ایک وسیع حرم ہے اور صحن کی باقی سمتوں میں کافی وسیع برآمدے ہیں۔ احاطہ کی زبردست دیوار میں چاروں گوشوں پر ایک مدور برج اور ان برجوں کے درمیان نیم مدور برج ہیں۔ حرم کی شمالی دیوار میں چھوٹے دریچوں کی ایک قطار ہے ان دریچوں کے سرے نعل دار یا کثیر برگی ہیں۔ یہ نمایاں خصوصیت قرطبہ میں بھی دکھائی دیتی ہے اس کے بارے میں ہاول کا خیال ہے کہ اس کی اصل شکل نے بدھ مت عہد کے ہندوستان میں جنم لیا تھا[۱]۔ اگر ہاول کا خیال غلط ہے

۱؎ ای۔ بی۔ ہاول، ہندوستانی فن تعمیر، (دوسرا ایڈیشن۔ لندن ۱۹۲۷ء) ص ص ۸۵ و ۸۶۔ (E. B. Havell, Indian Architecture)۔ ہاول نے یہ خیال اجنٹہ کے غاروں میں کٹی ہوئی ایک کمان کو دیکھ کر ظاہر کیا تھا لیکن اجنٹہ کی اس کمان کے بارے میں اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اصل میں یہ بانس کی بنی ہوئی ٹٹری کی شکل ہے اور اس کی نقل یہاں پتھر میں بنائی گئی اس طرح ایسی اور کسی اور قسم کی کمان کے ہندوستان پیدا ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مدت ہوئی ہاول کا خیال غلط ثابت ہو چکا۔

تو پھر مغربی فن تعمیر میں ایسی کمان اور اس کے تمام متعلقات مسلمانوں کا عطیہ ٹھیرتے ہیں۔ اس سے زیادہ اہم چیز قدیم عمارتوں کے ستونوں کے استعمال کا ترک کرنا ہے جیسے کہ یہ ستون چھتوں کو اٹھانے کے لئے قرطبہ اور دوسری جگہ استعمال ہوئے ہیں۔ ان قدیم ستونوں کی جگہ اینٹ کے پایوں نے لی ہے۔ یہ پائے ایک مربع بنیاد سے کر ہشت پہل بنائے گئے ہیں اور ہر پائے میں چار مدوّر یا ہشت پہل سنگ مرمر کے دہرے لگائے گئے ہیں۔ یہ ایک اور چیز ہے جو مغربی فن تعمیر میں داخل ہو گئی ہے سامرہ اور اس کے بعد جامع ابن طولون میں جو عجیب و غریب چکر کھاتا مینار بنایا گیا ہے ویسا مینار پھر آگے کہیں نہیں بنایا گیا۔

قاہرہ کی جامع ابن طولون ۲۶۳ھ میں بننی شروع ہوئی بہت سے مصنفوں نے اس مسجد کا حال تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے[۱] لیکن اسلامی فن تعمیر کی تاریخ میں اس کی اہمیت کچھ گھٹ سی گئی ہے جب سے کہ یہیں اس کی بعض نمایاں ترین خصوصیتیں عراق (مسوپٹیمیا) میں اس سے بھی قدیم ز عمارتوں میں مل گئی ہیں۔ یہ ایک وسیع جامع مسجد ہے۔ اس کا نقشہ تقریباً مربع ہے اور اس کا صحن تمام سمتوں سے چھتے دار برآمدوں سے گھرا ہوا ہے حرم کا ایوان دوسرے ایوانوں کی بہ نسبت زیادہ عمیق ہے۔ مسجد کی اصل دیواروں کے باہر چار دیواری سے گھرا ہوا ایک احاطہ (زیادہ) ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو اس سے پہلے کی مسجدوں میں کہیں نہیں ملتی۔ بیرونی دیواریں بہت دبیز ہیں۔ اور ان کے اوپر تزئینی کھڑ کنج لگائے گئے ہیں۔ یہی کھڑ کنج، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے گوتھک فن تعمیر کے جالی دار اور چوٹیوں والی منڈیروں کے لئے نمونہ بنے (ہر قسم کے کھڑ کنج آشوریہ میں آٹھویں صدی قبل مسیح میں اور مصر میں اس سے بھی پہلے مستعمل تھے) کھڑ کنج کے نیچے نکلیلے دریچوں کے موکھوں کی قطار ہے جن کے اندر پلاستر میں کٹی ہوئی جالیاں بٹھائی گئی ہیں اور پھر ان کے بیچ بیچ یکے بعد دیگرے نکیلی محرابیں ہیں جن کے سرے کثیر رگی یا نعل دار ہیں چھتے اینٹ کے زبردست

---

[۱] دیکھئے میری کتاب "اسلامی فن تعمیر" (آکسفورڈ ۱۹۲۶ء) کا تیسرا باب (مترجم)

Mohamadan Architecture

پایوں پر مشتمل ہیں اور گوشوں میں دیوار سے لگے ہوئے خشتی دھرے دئے گئے ہیں ان کے اوپر نکیلی کمانیں ہیں اور سطح حبیت کے پاس ان کا گھڑ نعلی خماؤ، بس یوں ہی محسوس ہوتا ہے۔ اس طرح عمارت کا پورا ڈھانچہ چوبی چھت کی سطح تک خشتی ہے اور اس پر سادہ یا تزئینی سنگستر لگایا گیا ہے۔ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مسجد ہر لحاظ سے عراقی (مسوپٹیمیائی) طرز کی مسجد ہے اور سامرا اور بغداد کی مسجدوں کے نمونوں پر بنائی گئی ہے جن سے اس مسجد کا بانی ابن طولون اپنے عہد جوانی میں خوب واقف تھا مذکورہ خصوصیات کے سوا دوسری جدتوں میں لکڑی میں کندہ کئے ہوئے کوفی کتبے بھی ہیں (تزئینی اغراض کے لئے حروف تہجی کا یہ استعمال نہایت درجہ ماہرانہ ہے) ان کے سوا رنگ میں عملاً تمام نمایاں سطحوں پر تزئین کاری ہے جو زیادہ تر سفید سنگستر سے بنائی گئی ہے اور چھت کی چوبی شہتیروں پر بھی یہ کام کیا گیا ہے۔ قبلہ نما محراب کا نقشہ بہت واضح بنایا گیا تھا، جو اب بدل دیا گیا ہے اس کے صحن کے وسط میں ایک فوارہ بھی ہے (یہ وہ اصلی عمارت نہیں جس کے اوپر ایک گنبد بھی تھا) نئی چیزوں میں چھت سے لٹکتے ہوئے شاندار جھاڑ فانوس بھی ہیں۔

نویں صدی کے آخر سے لے کر بارہویں صدی کے ختم تک کی باقی ماندہ اسلامی عبادت گاہوں یعنی مسجدوں کی گنتی زیادہ نہیں ہے اس عرصے میں کافی فوجی عمارتیں بنتی رہیں۔ اور یہ بات تو اب تسلیم کر لی گئی ہے کہ صلیبی لڑائیاں لڑنے والوں نے شام اور مصر کے قلعوں سے بہت سی چیزیں حاصل کی تھیں کیونکہ شام اور آرمینیا میں صدیوں پہلے سے سنگی تعمیر بہت اونچے درجے پر پہنچ چکی تھی۔ مثال کے طور پر اہل یورپ نے "مشربیات"[1] (machiolation فصیل میں روزن) کا استعمال اسی واسطے

---

[1] machiolation بڑے بڑے چھجوں یا توڑوں کی ایسی ترتیب جس میں چھجے یا توڑے نزدیک نزدیک اور منڈیر کی دیوار کے ساتھ بنائے جاتے ہیں۔ چھجے کے ہر جوڑے کے درمیان ایک موکھا اس کے لئے فرانسیسی زبان کا Machicoulis لفظ آتا ہے، ہوتا ہے اس موکھے میں فرشی دروازہ لگا ہوتا ہے۔ اس سے پانی اور دوسری ناخوشگوار چیزیں نیچے دیواروں میں سرنگ لگانے کی کوشش کرنے والے ماہرین پر پھینکی جا سکتی ہیں۔ ایسے روزنوں والے چوبی چھجے جو (hoarding) hourdes کہلاتے ہیں (Brattice) Bretèches اسی مقصد کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

سے سیکھا ہے۔

قاہرہ کے قلعہ پر مسٹر کے۔اے۔سی۔کرسول نے جو مضمون لکھا ہے اس کے ایک ضمیمہ میں انھوں نے مشربیات کا جائزہ لیا ہے[1] انھوں نے بتایا ہے کہ شام میں اس کی جو ابتدائی چھ سات مثالیں گنائی جاتی ہیں وہ حقیقت میں باہر کو نکلے ہوئے اسی طرز کے چھوٹے سے پاخانے ہیں جن کا رواج حالیہ زمانے تک عام تھا۔ جزیرہ جرسی (Jersey) کے شہر جوری (Gorey) میں ایک پائے پر بنا ہوا ایسا ہی ایک پاخانہ اب بھی زیر استعمال ہے۔ باقی تین مثالوں میں سب سے قدیم مثال چھٹی صدی عیسوی کے وسط کی ہے اور یہ مشربیات بلندی سے پتھر وغیرہ پھینکنے کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔ چھٹی صدی عیسوی کے یہ معنی ہوئے کہ یہ مثالیں اسلام کے آغاز سے پہلے کی ہیں۔ ان مثالوں پر مسٹر کرسول کے مضمون لکھنے کے بعد شام کے علاقے میں رصافہ کے مقام پر قصر الحیر میں ایک اسلامی مثال دریافت ہوئی ہے۔ جو ۷۲۹ء کی ہے اسی ہی دو مثالیں قاہرہ کے ایک دروازے باب النصر (۱۰۸۷ء) کے اوپر بنی ہوئی ہیں اس دروازے کو آرمینی سنگ راجوں نے بنایا تھا۔ یہ صاف طور پر مشربیات ہیں اور انھیں دروازے کی حفاظت کے لئے بنایا گیا تھا۔ یہ مثالیں یورپ کی ایسی اولین مثالوں سے کوئی ایک سو سال پہلے کی ہیں جو چیاتو گلارڈ (۱۱۸۴ء)[2]، شاتی یون (۱۱۸۶ء)[3]، ناروچ (۱۱۸۰ء)[4] اور ونچسٹر (۱۱۹۳ء)[5] دکھائی دیتی ہیں۔ اس طرح یہ بات واضح ہے کہ صلیبی محاربوں نے مسلمانوں سے اس کا خیال لیا ہے نہ کہ مسلمانوں نے صلیبی محاربوں سے۔ فرانس اور انگلستان کے چودہویں صدی کے قلعوں میں ہی مشربیات توڑوں کی قطاروں میں بنائے گئے اور اسی طریقے کو ان ملکوں میں بہت ترقی دی گئی فوجی تعمیر کاری کی ایک اور چیز جو مشرقی شام سے اہل یورپ نے لی ہے وہ قلعہ کی فصیل میں

---

[1] Mr. K. A. C. Creswell, In Bulletin de l'Institut Francais d'Archeologie, orientale. Vol. XXIII (Cairo 1924)

Winchester[5] De Norwich[4] Le chatillon[3] Chateau Gaillard[2]

زاویہ قائمہ والا، یا بل کھایا ہوا دروازہ ہے۔ اس کے ذریعہ ایسے دشمن کو جسے قلعہ کے دروازے تک پہنچنے میں کامیابی حاصل ہو گئی ہو قلعہ کے اندر کا حال دیکھنے یا گولہ باری کرنے سے روکا جاسکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے دروازے سے رومی یا بازنطینی فن حرب بے بہرہ تھا۔ رومی اور بازنطینی فن حرب میں تو یکے بعد دیگرے مدافعتی دروازے ایک ہی محور پر بنائے جاتے تھے اور ان کا درمیانی فصیل "پروپگ ناکولم" (Propugnaculum) کہلاتا تھا۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ایسے بل کھائے ہوئے دروازے بغداد کے مدور شہر (آٹھویں صدی) میں استعمال کئے گئے تھے۔ قاہرہ میں سلطان صلاح الدین کے بنائے ہوئے قلعہ (تعمیر کی ابتدا ۱۱۷۶ء) میں یہ پھر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی سب سے بہترین مثال حلب کے قلعہ میں دکھائی دیتی ہے۔ ایسے دروازے شاذو نادر ہی انگلستان میں دکھائی دیتے ہیں۔ اگرچہ کہ اس کی ایک عمدہ مثال بیومارس (Beaumaris) میں دکھائی دیتی ہے فرانس میں یہ زیادہ مقبول رہے اور سرکاسونے (Carcassonne) میں یہ بہت نظر آتے ہیں لیکن ان دونوں ملکوں میں مستحکم قلعوں کی فصیلوں کے لئے محرف دروازے زیادہ پسند کئے جاتے تھے۔ پیری فانڈس (Pierrefonds) اور کانوے (Conway) کے قلعے اسی کی مثالیں ہیں۔

ہندوستان میں پرانی دہلی کی عمارتوں سے پہلے کی کوئی اہم اسلامی عمارت موجود نہیں۔ پرانی دہلی کی عمارتیں تیرہویں صدی کے ابتدائی سالوں کی ہیں۔ ایشیائی ترکی میں بھی کوئی قابل ذکر چیز نہیں، یہاں بھی اسی زمانے کے لگ بھگ قونیہ کے مقام پر سلجوقی بادشاہوں کی بنائی ہوئی عمارتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اسپین اور شمالی افریقہ میں فوجی تعمیر کاری سے قطع نظر اہم آثار میں قرطبہ کی جامع کے زمانے کا کام ہے یہاں دسویں صدی کے نصف دوم میں کافی توسیعی کام ہوا ہے جیسے ۱۱۷۲ء سے ۱۱۹۵ء اور رباط (۱۱۷۸ء سے ۱۱۸۴ء) کے نفیس مینار ہیں[1]۔ یہ دونوں ں دار چھتوں سے مزین ہیں جو بعد کے کھڑکیوں کے اوپر کے آرائشی گوتھک کام سے مشابہ

[1] اشبیلیہ کا مینار اب "جیرالڈا ٹاور" (Giralda Tower) کہلاتا ہے۔

اور اس طرز کے پیش رو ہیں۔ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے یہ کام بہت دلچسپ ہے۔ اس میں گنبد سازی کا کمال بھی شامل ہے لیکن خود اسپین سے باہر اس کام نے تعمیر کاری کے ارتقا پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا۔ صقلیہ میں پلاٹینا کا کلیسا (Capella Platina) ۱۱۳۲ء میں بنا، مارتورانا کا گرجا (Martorana) ۱۱۳۲ء میں بنا، لازی زا کا قصر ۱۱۵۴ء میں، اور لاکوبا کا قصر (Lacuba) ۱۱۸۰ء میں بنا۔ یہ تمام مسلمہ سنین ہیں اور یہ سب کے سب اس جزیرے پر مسلم اقتدار کی حد کے باہر پڑتے ہیں۔ اس جزیرے کے صدر مقام پلرم (Palerma) سے مسلم اقتدار ۱۰۶۰ء میں اور بحیثیت مجموعی پورے جزیرے صقلیہ سے ۱۰۹۰ء میں اٹھ گیا۔ لیکن اگر یہ عمارتیں نارمنوں کی بھی بنائی ہوئی ہیں تب بھی ان میں خالص اسلامی خصوصیات کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ ایسی ہی اسلامی خصوصیات خود اطالیہ خاص میں یعنی امالفی (Amalfi) اور سیالرنو (Salerno) کے شہروں میں بھی دکھائی دیتی ہیں ایران میں اس عہد کی اہم عمارتوں میں اصفہان کی مسجد جمعہ، اور موصل کی جامع مسجد (۱۰۸۸ء — ۱۱۴۵ء) ہے۔ یہ دونوں مسجدیں بڑی جامع مسجدیں ہیں۔ اول الذکر مسجد میں کافی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ایرانی مسجدیں اینٹ سے بنتی تھیں۔ اس لئے انھیں سنگستر کی منبت کاری اور روغنی ٹائیلوں سے سجایا جاتا تھا۔ روغنی ٹائیلیں لگانے کا شوق تو اتنا بڑھا کہ آگے چل کر شام اور مصر جیسے ملکوں میں اب تک جہاں پتھر استعمال ہوتا تھا، ان ٹائیلوں کو استعمال کیا جانے لگا ایرانی مسجدوں میں مینار عام طور پر جوڑی میں بنائے جاتے تھے۔ یہ مینار استوانی شکل کے ہوتے تھے اور اوپر کو قدرے گاؤدم ہوتے جاتے تھے اور رنگین روغنی ٹائیلوں سے پٹے ہوئے تھے۔

ایم صلاح الدین نے انھیں کارخانوں کے دودکشوں سے تشبیہ دے کر ان کے ساتھ کچھ زیادہ انصاف نہیں کیا ہے ہاں اس میں شک نہیں کہ یہ مینار قاہرہ کے میناروں کے حسن اور ان کی نزاکت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ایران نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس عجیب و غریب قلمی آرائش[1]

---

[1] پہاڑی سلسلوں کے اندر کہیں کہیں قدرتی غاروں میں کاربونیٹ آف لائم کا تہ نشین مادہ عموماً قلموں کی شکل میں غار کی چھت وغیرہ سے لٹکتا رہتا ہے اور پانی کے رسنے سے بنتا ہے عمارتوں کے گوشوں میں جہاں ایسی ہی شکلیں بنائی جاتی رہیں "قلمی آرائش" کہا جاتا ہے (مترجم)

نواب رام

(stalactite) کی تزئین کا استقبال کیا جس کا حال ہم نے آگے بیان کیا ہے۔

"شامی مصری، مکتب تعمیر کی اہم عمارتیں سب کی سب قاہرہ میں پائی جاتی ہیں یہ جامع مسجدیں ہیں۔ ان میں جامع ازہر (۹۷۰ء)، جامع الحاکم (۹۹۰ء — ۱۰۱۲ء)، چھوٹی سی جامع الاقمر (۱۱۲۵ء) اور مقبرہ الجیوشی کی چھوٹی سی لیکن اہم مسجد (۱۰۸۵ء) شامل ہے۔ جامع ازہر اور جامع الاقمر میں چھتے قدیم زمانے کے ستونوں پر اٹھائے گئے ہیں۔ اور جامع الحاکم کے چھتے اینٹ کے پایوں پر بنائے گئے ہیں۔ جامع الحاکم میں پتھر استعمال کیا گیا ہے اور قاہرہ کی اسلامی عمارتوں میں پتھر کے استعمال کی یہ پہلی مثال ہے حالانکہ اس کے قریب ہی مقطم کی پہاڑیوں میں چونے کا نہایت نفیس پتھر دستیاب ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اب تک قاہرہ نے عراقی (مسوپٹیمیائی) روایتوں ہی کی پوری پوری پیروی کی تھی۔ جامع الجیوشی، مقبرہ کے ساتھ مسجد کی پہلی مثال ہے۔ آگے چل کر اسی طرز کو بہت زیادہ ترقی دی گئی اور اس میں نئی نئی چیزیں بڑھائی گئیں۔ اس مسجد میں مقبرہ اور مسجد کے بانی کی قبر پر ایک گنبد بنایا گیا ہے اور مقبرہ کی جنوبی دیوار میں ایک محراب نکالی گئی ہے۔ اس کا صحن چھوٹا ہے اور مسجد اور مقبرہ کے درمیان ایک چھتے دار عرضی حصہ ہے۔ مسجد سے لگا ہوا ایک مربع مینار ہے جو تین درجوں میں بنایا گیا ہے جیسے گنبد صقلیہ کے کلیساؤں کے اوپر نظر آتے ہیں۔ اسلامی فن تعمیر کی تاریخ میں گنبد کا ارتقا حد درجہ اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن مغربی تعمیر کاری پر اسلامی تعمیر کاری کی اس خصوصیت نے کچھ زیادہ اثر نہیں ڈالا ہے۔ اس لئے ہم اس مختصر سے جائزے میں اسے نظر انداز کرتے ہیں۔

کچھ ایسے ہی وجوہ کی بنا پر ہم یہاں اس لاجواب خصوصیت پر بحث نہیں کریں گے جو "قلمی آرائش" کہلاتی ہے۔ مسلمان جہاں کہیں بھی گئے ہیں، قلمی آرائش، ان کے ساتھ ساتھ ہر جگہ پہنچی ہے اور ہندوستان سے ... یہ ان کی تعمیر کاری کا امتیازی نشان بن گئی ہے غالباً یہ قلمی آرائش عراقی (مسوپٹیمیائی) ...دریہ پہلی بار یہ جامع الجیوشی کے مینار پر نمودار ہوئی ہے۔ پھر یہ جامع الاقمر ...ن ہے جہاں یہ تزئین کے لئے استعمال کی گئی ہے۔ یہاں ایسی محرابیں بھی ہیں جنہیں گھونگے کے خول سے مشابہ تراشا گیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی محراب یقیناً نشاۃ ثانیہ کی جانب

پہچانی صدف نما محراب کی پیش رو ہے پیش رخ کے سرے پر اس کے اطراف کوفی خط میں ایک تزئینی کتبہ چلا گیا ہے۔ اس عہد کی قاہرہ کی مسجدوں میں جو اور تفصیلات ملتی ہیں ان میں آرے کے دانتوں جیسے گھڑنج بھی ہیں یہ چیز بھی غالباً عراق (مسوپیٹمیا) ہی سے لی گئی ہے۔ اس حد بندی نے بھی وینس کے ڈیوکوں اور دوسرے لوگوں کے محلوں کے معماروں کو کافی متاثر کیا ہوگا۔

تیرہویں صدی کے بعد سے ہمیں تمام علاقوں میں اسلامی فن تعمیر کے آثار بہت ملتے ہیں۔ ان علاقوں کی فہرست میں ہندوستان اور ترکی کو شامل اور صقلیہ کو اس سے خارج کرنا چاہئے اسپین میں اہم محلات ہیں جو الحمرا اور العقصر کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ قصر اپنے چپے چپے کی نازک تزئین کے لحاظ سے بہت اہم ہیں اسپین میں بعد کے اسلامی دور میں جو عمارتیں بنی ہیں وہ درجۂ اول کی نہیں ہیں قاہرہ میں ۱۵۱۷ء تک نفیس ترین مسجدوں اور مقبروں کا ایک سلسلہ ملتا ہے ۱۵۱۷ء میں ترکوں نے اس شہر پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد سے جو چند مسجدیں بنیں ان کے لئے عثمانی ترکوں کی طرز اختیار کر لی گئی۔ اناطولیہ کے علاقے میں قونیہ اور بروسہ کے مقاموں پر تقریباً ۱۲۰۰ء سے لے کر ۱۴۵۳ء تک نہایت دلچسپ مثالوں کا ایک سلسلہ ملتا ہے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ ترکی کا دارالحکومت بن گیا۔ اس تاریخ کے بعد سے عثمانی تعمیر کار قاہرہ اور دمشق جیسے دور دست علاقوں میں تک عمارتیں بناتے وقت بازنطینی عمارتوں سے بہت سی چیزیں نہایت آزادی کے ساتھ مستعار لینے لگے۔ ایران ترکستان اور ہندوستان میں بعد کے دوروں کی اسلامی عمارتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ موجود ہے اور ہندوستان میں حالیہ زمانوں تک بھی ان ہی تعمیری روایتوں کو اپنے پیش نظر رکھا گیا ہے اسلامی تعمیر کاری کے بعد کے پانچ اہم مکاتیب میں واضح مقامی خصوصیات ایک دوسرے میں امتیاز پیدا کرتے ہیں۔ یہ پانچ مکاتیب حسب ذیل ہیں: شامی مصری مکتب، اندلس کا اسلامی مکتب، ایرانی مکتب، عثمانی ترکوں کا مکتب اور ہندوستانی مکتب۔ ان مکتبوں کے یہ باہمی اختلافات ایک حد تک قابل حصول تعمیری مسالے کا نتیجہ ہیں۔ لیکن بڑی حد تک ان اختلافات کی بنیاد تعمیری روایتوں پر رکھی ہے۔

'قرونِ وسطے' میں مسجد کے نقشے کے ارتقاء میں بڑا تنوع نظر آتا ہے بعض ملکوں میں اب بھی جامع مسجدیں بنتی رہیں۔ مقبرہ کے ساتھ مسجد بنانے کا شوق بہت مقبول ہوا۔ اس فہرست میں مدرسہ یعنی صلیب نما مدرسہ اور مسجد بھی آجاتی ہے جس کا نقشہ بارہویں صدی میں ایجاد ہوا۔ گنبد اسلامی تعمیر کاری کا ایک محبوب نشان بن گیا۔ قاہرہ میں اس کی شکل اونچی سی ہوتی تھی' ایران اور ترکستان میں پھولے ہوئے یا بیضوی گنبد زیادہ پسند کئے جاتے تھے اور ادھر قسطنطنیہ کی مسجدوں میں دبے ہوئے بازنطینی گنبد بنائے جاتے تھے۔ مصر کے سنگی گنبدوں کو باہر کی طرف پندرہویں صدی میں لیس نما نمونوں سے سجایا جاتا تھا۔ ایران میں گنبد تابناک کاشی کاری سے مزین کئے جاتے تھے۔ ان گنبدوں کو قلمی آرائش میں بنے ہوئے گنبد کے گردی حصے سہارتے تھے۔ بے شبہ قلمی آرائش ہر جگہ استعمال ہوتی تھی۔ اکثر تو یہ آرائش ضرورت سے زیادہ ہوتی تھی۔ کبھی تو یہ قلمی آرائش چھت سے اسی طرح آویزاں کی جاتی تھی جس طرح کہ ہماری پنکھا نما انگریزی لاڈ چھتوں میں 'آویزے' ہوتے ہیں۔ ایک طرف اگر اسلامی گنبدوں نے مغرب کے نشاۃ ثانیہ کے گنبدوں کو بہت کم متاثر کیا ہے تو دوسری طرف یہ بہت ممکن نظر آتا ہے۔ کہ دلکش طرز کے اسلامی میناروں نے اور خاص کر چودہویں اور پندرہویں صدی کی قاہرہ کی عمارتوں میں پائے جانے والے میناروں نے نشاۃ ثانیہ میں اطالیہ کے گھنٹہ گھر (companile) اور ایسے ہی مشہور تعمیرکار کرسٹوفرون (C. Wren) کے بنائے ہوئے شہر کے بعض نفیس نکیلے میناروں کو متاثر کیا ہوگا۔ بے شبہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد تک اسلامی تعمیرکاروں مینار کو ایک دوسرے کے مقابل بنانے کے امکانات محسوس کرلیئے تھے ہی جیسے کرسٹوفران نے آگے چل کر سینٹ پال کے کلیسا میناروں کو نہایت موثر انداز میں ایک دوسرے کے مقابل استعمال کیا۔ ایران کے قدرے بے ڈول سے استوانہ نما میناروں اور عثمانی ترکوں کے محبوب پنسل نما طرز کے میناروں کو اپنے وطنوں کے باہر کہیں بھی حسن قبول حاصل نہیں ہوا۔

جیسے جیسے اسلامی تعمیر کاری آگے بڑھتی گئی مدور گھڑ نعلی کمانوں اور نکیلی گھڑ نعلی کمانوں کا حسن قبول برقرار رہا۔ نیم مدور یا معمولی نکیلی یا دو مرکزوں والی کمان جس کی سطح جبست کا خم او سیدھے خطوط میں تبدیل ہو جاتا ہے، زیادہ تر اپنے وطن میں اور باہر کہیں کہیں استعمال ہوتی رہی۔ یہ کمان کسی قدر ہماری ٹیوڈر (Tudor) کمان سے ملتی جلتی ہے۔ کثیر رگی یا کثیر نعلی کمانیں عام ہوگئیں اور خستی ڈاٹ کے چھتوں اور خستی ڈاٹوں کی شکل میں سطح کی تزئین کے لئے استعمال کی جانے لگیں۔ گھر گم میں کئی شاخیں نکالی جانے لگیں یا انھیں دندانہ نما بنایا جانے لگا۔ کھڑکیوں کے موکھوں میں پتھر کا کٹاؤ کا کام کیا جاتا رہا یا ان میں جالیاں لگائی جاتی رہیں یہ کام یا تو پتھر میں ہوتا یا سنگسترمیں۔ ان میں بھدے رنگ کے شیشے لگائے جاتے تھے اور غالباً اس سے پہلے لگائے جاتے تھے جب کہ مغربی ملکوں میں رنگین شیشوں کا رواج ہوا۔ سطح کی زیبائش کے لئے تزئینی کتبے لگائے جاتے تھے جو یا تو سنگسترمیں ڈھالے جاتے تھے یا لکڑی کے اندر کندہ ہوتے تھے اور ان کے بیچ بیچ میں ہندسی شکلیں دی جاتی تھیں کیونکہ اسلامی دینیات کی رو سے جانداروں کی شکلیں بنانے کی اجازت نہ تھی۔ کندہ کاری میں نمایاں ابھرواں کام مصر کی اسلامی عمارتوں میں کہیں کہیں دکھائی دیتا ہے حالانکہ ہندوستان میں ایسا کام بہت دکھائی دیتا ہے نہایت نازک ہندسی سطحی نمونوں کے آزادانہ استعمال سے اس کو موثر بنایا جاتا ہے۔ یہ ہندسی نمونے پتھر یا سنگسترمیں کندہ ہونے کی بہ نسبت گودے ہوئے سے ہوتے ہیں۔ اور آگے مشرق میں خاص کر ایران اور ترکستان میں جہاں اینٹ عام تعمیری مسالہ ہے، روغنی ٹائیلوں سے بہت زیادہ کام لیا گیا ہے۔ ایک عرصے تک ان ٹائیلوں کے لئے ہندسی اور بے جان چیزوں کی شکلوں کے نمونے ہی زیادہ پسند کئے جاتے رہے پھر زیادہ فطری انداز اختیار کیا گیا اور گل بوٹوں کے بنانے کا رواج ہوا۔ انگریزی زبان میں " Arabesque " (گل بوٹے) کی اصطلاح جو انگلستان میں کم ابھرواں کام کے لئے ملکہ الزبتھ کے زمانے سے اب تک استعمال ہوتی چلی آرہی ہے، اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اس بارے میں ہم کسی نہ کسی طرح قرون وسطیٰ کے عربوں کے ضرور احسان مند ہیں[۱] تزئین کی ایک اور صورت جو قاہرہ میں عام ہے لیکن اور دوسرے مقاموں پر اتنی عام نہیں، بلکے

[۱] ان تمام بحثوں کے لئے میری کتاب "مصر اور فلسطین میں اسلامی فن تعمیر" کا دسواں باب اسلامی تزئین کاری کی ماہیت ملاحظہ ہو

اور گہرے رنگ کے پتھروں کا چنائی کے افقی دوروں میں پیچھے بعد دیگرے استعمال کرنا ہے اس رواج کی اصل روما یا بازنطینہ سے منسوب کی جاتی ہے جہاں پتھر کی دیواروں میں خشتی، چنائی کے دور دقفے دقفے سے استعمال کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ بات ابھی مشتبہ ہی ہے اسی طرح پیسا (Pisa)، جنیوا، سینا (Siena) فلارنس اور اطالیہ کے دوسرے شہروں میں سنگ مرمر کی عمارتوں کے دہاری دار رد کار غالباً قاہرہ ہی سے لئے گئے ہیں، کیونکہ قرون وسطیٰ کے دوران میں قاہرہ سے ان شہروں کے گہرے تجارتی تعلقات قایم تھے ایسے ہی اور گنے (Auvergne) کے دقرے پیو (Puy) اور ہمارے وطن کے شہر نارتھ ہامپٹن (Northampton) کے سینٹ پیٹر کلیسا میں مختلف رنگوں کے پتھروں کی تعمیرکاری نظر آتی ہے۔

اسلامی فن تعمیر کے اس جائزے کے دوران میں جن مختلف نقاط کا ذکر ہوا ان سب کو پیش نظر رکھئے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مجموعی حیثیت سے مغربی دنیا نے اسلام سے تعمیر کاری میں جو قرض لیا ہے وہ حقیقی اور واقعی ہے صرف فوجی تعمیر کاری ہی کے میدان میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ صلیبی معماروں نے (جنہوں نے ارض مقدس میں بہت سے نفیس کلیسا اور قلعے اپنی یادگار چھوڑے ہیں) قلعہ بندی کے فن میں بہت سی چیزیں اپنے دشمن مسلمانوں سے سیکھی تھیں اور خود مسلمانوں نے اس سلسلہ میں آرمینی سنگ راجوں کی مہارت سے فائدہ اٹھایا تھا۔

آرمینیا اور شام کی سنگی اور ایران کی خشتی قبل اسلام عمارتوں سے (ایران کی ان قبل اسلام خشتی عمارتوں کے بارے میں اب علما میں یہ خیال عام ہوتا جا رہا ہے کہ ہم نے قرون وسطیٰ میں لداؤ چھتیں بنانے کا طریقہ ان ہی عمارتوں سے لیا ہے) ہم نے جو کچھ لیا ہے اس قرض کو منہا کر دیا جائے تب یہ ماننا پڑے گا کہ شام اور دوسرے ملکوں کی اسلامی عمارتوں میں جو نکیلی کمان استعمال کی گئی ہے ان ہی کی ایجاد ہے۔ دہرے انحنا والی نکیلی کمان قریب قریب یقین کی حد تک اور ٹیوڈر کمان ہے دونوں کمانیں ایک ایسی ہی اصل سے تعلق رکھتی ہیں کئی نعلوں اور کئی نعل دار یا کثیر رگی کمانوں کا استعمال بھی اسی ذریعہ سے آیا ہے۔ اسی طرح غالباً سطحوں کی تزئینی نمونے اور ممکن ہے دریچوں میں

سلاخوں کے ذریعہ تزئین بھی یہیں سے لی گئی ہے۔ گل بوٹوں کے نقشے ابتدائی مسجدوں میں پتھر یا سنگ مرمر میں بنی ہوئی ہندسی شکلوں کی جالیوں سے لئے گئے ہیں یا یہ ممکن ہے کہ یہ چیز اور بھی آگے کے قبل اسلام زمانے میں شام اور مسوپٹیمیا (عراق) کی عمارتوں میں استعمال ہو چکی تھی۔ بعض اوقات رنگین شیشوں کی ایجاد کا سہرا مشرق کے سر باندھا جاتا ہے لیکن یہ بات اب تک ثابت نہیں ہوئی ہے بابوں کے گوشوں میں دیوار سے لگا کر دھرے دینا جسے گوتھک چھتوں کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے آٹھویں یا نویں صدی کی ایک اسلامی ایجاد ہے۔ تزئینی اور جال دار گھڑ گج عراق (مسوپٹیمیا) سے قاہرہ منتقل ہوتے یہاں سے یہ اطالیہ منتقل ہوئے اور آگے چل کر گوتھک فن تعمیر کی ایک خصوصیت بن گئے۔ بعد کی گوتھک عمارتوں میں مبنت کاری میں بنے ہوئے کتبے جو تزئین کے لئے استعمال کئے گئے ہیں نویں صدی کی جامع ابن طولون کی نقل میں بنائے گئے ہیں لیکن فرانس کے جنوبی علاقوں پر مسلمانوں کے اقتدار کے دوران میں کوفی رسم خط میں لکھے ہوئے کتبے فرانس تک پہنچ چکے تھے[1] اور انگلستان میں تک تزئین کی بعض نادر مثالوں میں عربی اثر کی غمازی ہورہی ہے۔ دہاری دار روکار قاہرہ سے آئے ہوں گے۔ ایسے ہی نشاۃ ثانیہ کے گھنٹہ گھر (companila) اور نشاۃ ثانیہ کی صدف نما محرابیں بھی یہیں سے آئی ہوں گی۔ عربی "مشربیہ" یا چوبی جالیاں جو مکان کے زنانے حصے کو چھپانے یا مسجد میں آرٹ کے طور پر استعمال ہوتی تھیں ان کی انگلستان کی دہاتی جالیوں میں نقل کی گئی ہے۔ گل بوٹوں کی ہلکی مبنت کاری کے ذریعہ عمارت کی سطحوں کی تزئین یا ماہی پشت جال کے ذریعہ دیواروں کا سجانا اور زینت کے لئے ہندسی شکلوں کا استعمال

---

[1] یعنی ماہر بغدادی مبنت کار گاؤ فرے ڈس (Gaufredus) کے مبنت کار چوبی دروازے جو لے پوی (Le Puy) کے کلیسا کی ایک چھوٹی سی کمان میں لگے ہوئے ہیں اور دوسرا مبنت کار دروازہ لاووتے شیلیک (Lavoute Chilac) میں لگا ہوا ہے۔ دسٹ منسٹر ایبے کے اوپری حصہ میں تزئینی پٹیوں اور بعض ابتدائی رنگین شیشوں کے دریچوں کی اصل کے بارے میں پروفیسر لیتھا بے (Lethaby) نے ایسا ہی خیال ظاہر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو برلنگٹن میگزین میں اے۔ ایچ۔ کرسٹی کا مضمون The Develoyment of ornament from Arabic script Burlington Magazine Vols XI-XII, 1922

ان سب چیزوں کے لئے ہم مسلمانوں قوموں کے ممنونِ احسان ہیں۔ یہی قومیں ہمارے علم ہندسہ کا بہت بڑا ماخذ یا ذریعہ رہی ہیں۔

اوپر جو باتیں بیان ہوئیں وہ موٹی موٹی سی باتیں تھیں لیکن صلیبی لڑائیوں کے دوران میں اور زیادہ پرامن طریقہ پر) قرونِ وسطیٰ کے آخری زمانے میں مشرق اور مغرب کے قریبی رابطہ نے تعمیر کاری پر اور بھی اثرات ڈالے ہوں گے جن کا اس سرسری جائزے میں ذکر نہ ہو سکا۔ اسپین میں اسلامی تعمیر کاری کی روایات نشاۃ ثانیہ کے آخری عہد تک برقرار رہیں اور یہی روایتیں اسپین کی گوتھک تعمیر کاری کی بہت سی گتھیوں اور عجیب وغریب چیزوں کا حل پیش کرنے میں مدد دیتی ہیں آخر میں یہ بات بھی دھیان میں رکھی جائے کہ اب بھی بعض دور دراز ملکوں میں اسلامی تعمیر کاری سے کام لیا جا رہا ہے جہاں وہ ایک ہزار سال سے بھی زیادہ زمانے سے پھلتی پھولتی چلی آ رہی ہے۔

حوالے

M.S. Briggs: Mohammaden Architecture in Egypt & Palastine (Oxford, 1924) E. Diez: Die Kust der Islamischen Volker (Berlin, 1915) J. Franz: Die Bankunst des Islam (Darmsladt, 1887) A. Gayet: L'artarabe (Paris, 1893.) Richmond, E.T. Moslem Architecture, 623-1516: Some causes & Consequances. Royal Asiatic Society. (Lo.
G.T. Rivoira: Moslem Architecture: its origin development (Oxford 1918) H. Saladin: Manuel d'art musulman: tome 1, Architecture (Paris, 1907)